فتنہ اور فساد میں سلامت روی اور استقامت کے رہنما اصول

تالیف

فضیلۃ الشیخ صالح بن عبد العزیز آل الشیخ حفظہ اللہ

(وزیر الشئوون الاسلامیۃ والاوقاف والدعوۃ والارشاد، سعودی عرب)

ترجمہ

ڈاکٹر عبد الرحمن بن عبد الجبار الفریوائی

(استاذ حدیث جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ، ریاض)

انتباہ

© حقوق محفوظ اصلی اہل سنت ڈاٹ کام ۲۰۱۰

www.AsliAhleSunnet.com

اہم نوٹ

کتاب ھذا ایک آن لائن کتاب ہے جو ویب سائٹ اصلی اہل سنت ڈاٹ کام کے لئے شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کو خصوصی طور پر انٹرنیٹ پر رکھنے کے لئے مرتب وکمپوز کیا گیا ہے تاکہ اس کی باآسانی نشرواشاعت ہوسکے۔فی الوقت ہمارے علم کے مطابق اس سے پہلے یہ نیٹ پر جاری کرنے کے لئے خصوصی کمپوزنگ کہیں اور موجود نہیں۔چونکہ اس کتاب کو مفت آن لائن تقسیم کے لئے جاری کیا جارہا ہے لہذا اس کی ذاتی یا تبلیغی مقاصد کے لئے پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذریعہ سے محض اس کے مندرجات نشر کرنے کی اجازت مرحمت کی جاتی ہے لیکن اسے منافع کمانے کے لئے چھاپنے (پبلش) کرنے کی اجازت نہیں الا یہ کہ اصل پبلیشرز سے پیشگی اجازت طلب کی جائے اور اس کی اجازت دے دی جائے۔

نام کتاب	:	فتنہ وفساد میں سلامت روی اور استقامت کے رہنما اصول
مؤلف	:	فضیلۃ الشیخ صالح بن عبد العزیز آل الشیخ حفظہ اللہ
ترجمہ	:	ڈاکٹر عبد الرحمن بن عبد الجبار الفریوائی
صفحات	:	۴۸
ناشر	:	اصلی اہل سنت ڈاٹ کام (انٹرنیٹ ایڈیشن)
نظر ثانی	:	طارق علی بروہی

ASLIAHLESUNNET.COM

مقدمہ

سب تعریفیں اللہ رب العزت کے لئے ہیں، سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ☆ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ☆ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ (الحج: ۶۷-۶۹)

(ہر امت کے لئے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کر دیا ہے، جسے وہ بجالانی والے ہیں۔ پس انہیں اس امر میں آپ سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے، آپ اپنے رب کی طرف بلایئے۔ یقیناً آپ ٹھیک ہدایت پر ہی ہیں۔ پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے الجھنے لگیں تو آپ کہہ دیں کہ تمہارے اعمال سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے۔ بے شک تمہارے اختلاف کا فیصلہ قیامت کے دن خود اللہ تعالیٰ کرے گا)

ساری حمد و ثنا اس رب کے لئے ہے جس کا ارشاد ہے:

﴿أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ☆ وَمَن يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّضِلٍّ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انتِقَامٍ﴾

(الزمر: ۳۶-۳۷)

(کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟ یہ لوگ آپ کو اللہ کے سوا اوروں سے ڈرا رہے ہیں، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ اور جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ عزیز (غالب) اور بدلہ لینے والا نہیں ہے؟)

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک

نہیں، اس شخص کی گواہی کی طرح جس کے دل ودماغ میں کلمہ توحید اس طرح رچ بس گیا ہو کہ اس کی مدد سے وہ اللہ رب العزت کی پسند اور مرضی کے اقوال وافعال کا علم حاصل کرلے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے ،اس کے رسول اور اس کے برگزیدہ خلیل ہیں۔ آپ بشیر ونذیر ہیں۔ آپ نے لوگوں کو جنت کی بشارت دی، جہنم سے ڈرایا، رشد وہدایت کا کام کیا۔ لوگوں کو تعلیم دی جس شخص نے آپ کی سنت پر عمل کیا، آپ کے نقش قدم پر چلا، اور آپ کی ہدایت سے روشنی حاصل کی وہ مبارکبادی کا مستحق ہے۔

وصلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ ومن اھتدی بھداھم الی یوم الدین۔ اما بعد۔

برادران اسلام! فتنہ وفساد اور آزمائش وابتلاء سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگئے۔ دین کو بھسم کردینے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگئے۔ عقل کو ماؤف کردینے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگئے، جسم کو فنا کردینے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگئے۔ ہر خیر اور بھلائی کو ناپید کرنے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگئے۔ ان تمام فتنوں سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگئے، بے شک فتنہ وفساد میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو نہیں، نبی اکرم ﷺ فتنوں سے بہت زیادہ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب فرماتے تھے۔ اور مسلمانوں کو ان سے ڈراتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے جب اپنی صحیح میں کتاب الفتن کا ذکر فرمایا تو اس کی ابتدا اس باب سے کی: ''باب قول اللہ تعالی:﴿ وَاتَّقُواْ فِتْنَةً لاَّ تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً﴾(الانفال:۲۵) وما کان رسول اللہ ﷺ یحذر من الفتن''۔

''باب: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اور تم ایسے فتنے سے بچو، جو خاص کر صرف انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا، جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں''۔ اور یہ بیان کہ رسول اللہ ﷺ فتنوں سے ڈراتے تھے''۔

اس لئے کہ جب فتنے سر اٹھاتے ہیں تو صرف ظالم ہی ان کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ اس

کے دائرہ میں سارے لوگ آجاتے ہیں۔اور جب یہ فتنے برپا ہو جاتے ہیں، تو کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔

اس لئے ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ فتنوں کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ہم اس سے ڈریں اور ہر اس چیز سے اپنے آپ کو حقیقی طور پر اور سختی سے دور رکھیں جو ان فتنوں سے قریب کر سکتی ہے۔ کیوں کہ فتنوں کی کثرت قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

(یتقارب الزمان، ویقل العمل ،ویلقی الشح، وتکثراو قال: تظھرالفتن)

(زمانہ سکڑ جائے گا، عمل کم ہو جائے گا، بخل عام ہو جائے گا، فتنے زیادہ یا ظاہر ہو جائیں گے)

اور اس لئے کہ فتنوں کے ظہور کے ساتھ فساد کی آمد ہو گی جس کے باعث قیامت قریب تر ہو جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ کا ہمارے ساتھ شفقت و رحمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے ہمیں ہر طرح کے فتنوں سے ڈرایا، اللہ رب العزت نے بھی ہمیں اپنے اس ارشاد میں ان فتنوں سے ڈرایا ہے:

﴿وَاتَّقُواْ فِتْنَةً لاَّ تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً﴾ (الانفال:۲۵)

(اور تم ایسے فتنے سے بچو جو خاص کر صرف انہیں لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں سے ان ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اگرچہ اس آیت کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں لیکن یہ سارے مسلمانوں کے لئے ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ فتنوں سے ڈراتے تھے"

علامہ آلوسی اپنی تفسیر (روح المعانی) میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں:

''ارشاد باری تعالیٰ﴿ وَاتَّقُواْ فِتْنَةً لاَّ تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً﴾ میں فتنہ کی تفسیر کئی چیزوں سے کی گئی ہے،ان میں سے چند یہ ہیں۔۱) امر بالمعروف ونہی عن المنکر (بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے)میں مداہنت۔۲) آپس میں اختلاف اور نا اتفاقی۔۳) بدعتوں کے ظہور پر نکیر نہ کرناوغیرہ۔''

فرمایا:''اور موقع ومحل کی مناسبت سے یہ سارے معانی مراد ہیں''

یعنی جب اختلاف وانتشار اور تفرقہ کا زمانہ ہو تو ہم ایک دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذریعہ ڈرائیں ﴿وَاتَّقُواْ فِتْنَةً لاَّ تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنكُمْ خَآصَّةً ﴾ یعنی تفرقہ واختلاف کے فتنہ سے بچو جس کی زد میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے بلکہ اس سے سارے لوگ متاثر ہوں گے،اوراس تفرقہ واختلاف کااثر صرف ظالم تک محدود نہ ہو گا۔

اس لئے خلیجی بحران کے اس موقع پر ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں،چونکہ ہم باذن اللہ تعالیٰ اس مملکت (سعودی عرب) میں صحیح اسلامی بیداری کامشاہدہ کررہے ہیں، جس نے توحید کا علم بلند کرر کھاہے،یہ مملکت اس عہد میں دعوت توحید کی مبلغ ہے، جب کہ اس دعوت توحید کے مبلغ کہیں اور نظر نہیں آرہے ہیں۔الا ماشاءاللہ۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم عام لوگوں کواوراپنے آپ کو یہ یاددہانی کرائیں کہ مفیداور نفع بخش علم کا اہتمام ہم پر لازم ہے ۔سلف صالحین کے عقیدہ سے دلچسپی اور اہل سنت والجماعت کے عقائد سے تعلق لازم اورضروری ہے۔

اس بابرکت اسلامی بیداری سے ہمیں توقع ہے کہ اس سے اللہ کادین پھیلے گا،لوگوں میں استقامت وشریعت مطہرہ سے محبت پیداہوگی، ہمیں اس اسلامی بیدارسے یہ توقع ہے کہ علم نافع اس کی اساس اوربنیاد ہواس لئے کہ اس وقت ہمارے نوجوان علم نافع کے بہت زیادہ حریص اوراہل سنت والجماعت کے اقوال کے شیدائی ہیں۔

مذکورہ وجوہ واسباب کی بناپر مجھ پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ میں یہاں پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ پر مبنی اپنے ائمہ اہل سنت والجماعت کے اقوال کو اپنے علم کی حد تک آپ تک پہنچادوں اور اس کی یاددہانی کرادوں۔

اگر اہل علم کے یہاں گہری اور فیصلہ کن بصیرت وتدبیر، اور حالات کی حقیقی شناخت و پہچان معدوم ہو جس کی روشنی میں اللہ ورسول کی مرضی کے مطابق وہ جدید حالات سے نبرد آزما ہوں، یا وقوع پذیر فتنوں کا مقابلہ کریں، تو ایسے حالات میں ان فتنوں کے منظر وپس منظر سے عدم واقفیت اور نتائج سے چشم پوشی کی صورت میں ہمیں مستقبل میں بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس لئے شرعی اصول اور ضابطوں کی رعایت ضروری ہے، کیوں کہ ان کی مدد سے آدمی اپنے آپ کو غلطیوں کے ارتکاب سے محفوظ رکھ سکتا ہے، ان شرعی اصول وضوابط اور آداب کا لحاظ اور ان کی پابندی، اور اس کے مطابق چلنے کے نتیجہ میں ان شاءاللہ ہمیں وہ برکات وخیرات نصیب ہوں گی، کہ اس کے بعد ہمیں ندامت کا سامنا ہرگز نہیں کرنا پڑے گا۔

ہر چیز کے ضابطہ کی معرفت اور اس کا علم ضروری ولابدی ہے تاکہ برادرانِ اسلام کو اس صورت حال سے دوچار نہ ہونا پڑے کہ وہ نامعلوم انجام کی طرف کھینچ لئے جائیں۔ یا خود سے اس نتیجہ سے دوچار ہو جائیں جس کا نفع ونقصان معلوم نہ ہو، اس سے پتہ چلا کہ اہل سنت والجماعت کے بیان کردہ ضوابط وقواعد کی پابندی ضروری ہے، تو ضابطہ اور قاعدہ کی کیا تعریف ہے؟

کسی مسئلہ میں ضابطہ یا اصول کا کام یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے ایک باب کے مسائل کے حکم کو عمدگی کے ساتھ جان لیتے ہیں۔ اور ایک باب کے مسائل میں اس ضابطے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اور قاعدہ: ایک ایسے کلی امر کو کہتے ہیں جس کی طرف مختلف ابواب وموضوعات کے

مسائل میں رجوع کیا جاتا ہے۔اس لئے ہم پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ہم اہل سنت والجماعت کے ان ضوابط و قواعد کو اپنائیں۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

﴿انه من يعش منكم فسيرى اختلافاً كثيرا ،فعليكم بسنتي وسنة الخفاء الراشدين المهديين من بعدى۔ تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ﴾

(تم میں سے جو زندہ رہے گا تو بہت سارے اختلافات دیکھے گا، پس تم میرے طریقہ اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقہ کو لازم پکڑ لو اور مضبوطی سے اس پر ڈٹے رہو)

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام ﷺ نے اختلاف و افتراق کو دیکھا اور سنت نبویہ اور خلفاء راشدین کے واضح اصولوں کی پابندی ہی سے ان کو ان اختلافات سے چھٹکارا ملا۔

مذکورہ قواعد وضوابط کی پابندی سے حاصل ہونے والے فوائد:

سب سے پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ ان قواعد وضوابط کی رعایت سے مسلمان کی فکر و فہم غیر شرعی فکر و فہم کے تصور سے محفوظ رہتی ہے۔یہ فکر مسلمان کی عقل کو اس کے اپنے افکار و تصورات میں ایک ضابطہ فراہم کرتی اور اس کو عصمت کی راہ پر ڈالتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ مسلمان اگر قاعدہ وضابطہ کی مرجعیت سے ہٹ کر کسی مسئلہ پر غور وفکر کرتا ہے تو اس کی عقل اس کو خود اپنی ذات کے بارے میں یا خاندان کے بارے میں یا سوسائٹی کے بارے میں یا اپنی قوم وملت کے بارے میں مختلف راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ایسی صورت میں ان قواعد وضوابط کے برتنے کی اہمیت کا ہمیں علم وادراک ہوتا ہے۔کیوں کہ یہی قواعد وضوابط ہی مسلمان کی عقل کو اس کی اپنی ذات، یا خاندان یا سوسائٹی میں تصرف کرنے کے افکار وخیالات کو منظم کرتے ہیں۔

ان قواعد وضوابط کی پابندی کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ مسلمان کو غلطیوں سے

محفوظ رکھتے ہیں۔اس لئے کہ اہل سنت والجماعت کے قواعد وضوابط کی رعایت نہ کرتے ہوئے اگروہ پیش آمدہ مسائل میں یا فتنہ کے ظہور کے وقت کوئی اقدام کرتا ہے اورانہیں اپنی عقل و فکر سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس سے غلطیاں سرزد ہونے کا امکان ہے، اور غلطیوں میں پڑنے کی صورت میں اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ ایسی صورت میں بتدریج غلطیوں کا ارتکاب کرے گا اور پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس سے مزید غلطیاں واقع ہوں۔

قواعد وضوابط کی پابندی کی صورت میں یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ اس سے انسان غلطی سے دور رہتا ہے، یہ کیوں ؟اس لئے کہ ان قواعد وضوابط کو کن لوگوں نے بنایا ہے۔ان کو اہل سنت والجماعت نے دلائل کی روشنی میں وضع کیا ہے اور دلیل کے پیچھے چلنے والا اور اہل سنت والجماعت کے نقش قدم پر چلنے والا ہرگز ندامت وشرمندگی کا سامنا نہیں کرے گا۔

ان قواعد وضوابط کی پابندی کا ایک تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ قواعد مسلمانوں کو گناہوں سے دور رکھتے ہیں۔اس لئے کہ جب مسلمان اپنی مرضی اور رائے کے مطابق چلیں یا آپ اپنی رائے اور اپنے گمان کو درست سمجھ کر اس پر چلیں اور مذکورہ قواعد وضوابط کی رعایت نہ کریں تو گناہوں سے مامون اور محفوظ نہیں رہ سکتے۔اس لئے کہ ایسی حالت میں آپ کے قول اور فعل کا مستقبل میں کیا انجام ہوگا اس کا علم آپ کو نہیں ہے۔ لیکن اگر دلائل پر مبنی اصول و ضوابط کی پابندی کریں گے تو یہ آپ کو باذن اللہ گناہوں سے دور رکھیں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں آپ معذور ہوں گے۔اس لئے کہ آپ نے دلیل کو اپنا رہنما بنایا اور دلیل کو رہنما بنانے والے نے اچھا اقدام کیا۔

برادران اسلام ! مذکورہ بالا تینوں فوائد سے ہم پر یہ بات واضح ہوئی کہ ان شرعی قواعد و ضوابط، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، کی پابندی ایک ضروری چیز ہے۔

جو قواعد اور ضوابط ہم بیان کریں گے ان کا ماخذ اور ان کی دلیل دو چیزوں میں سے ایک ہو گی:

ا۔ان اصول و قواعد پر قرآن یا سنت کی صراحت اور دلالت اور کتاب و سنت سے ماخوذ ان دلائل سے اہل سنت والجماعت کا تمسک۔

۲۔ان قواعد و ضوابط کا دوسرا ماخذ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عملی سنت ہے۔ صحابہ کرام،تابعین عظام اور ائمہ اہل سنت والجماعت کا فتنوں کے ظہور کے وقت ایک تعامل رہا ہے۔اس سلسلے میں ان کا ایک طریقہ رہا ہے کہ احوال کی تبدیلی میں انہیں کس بات کی رعایت کرنے ہے اور یہ کہ ایسے حالات میں انہوں نے دلائل کا سہارا لیا،ان دلائل کی تطبیق کی اور عملی طور پر ان کو بروئے کار لائے،اس لئے اگر ہم ان کی سنت اور ان کے تعامل کو اپنائیں،ان کے دلائل سے تمسک کریں ،اور ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو نہ ہماری نگاہیں منحرف ہوں گی اور نہ ہماری عقلیں گمراہ ہوں گی۔

اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی من جملہ رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے کہ اس نے ہمیں بغیر اسوہ و قدوہ کے نہیں چھوڑا ہے۔اس لئے ہمیں علماء اہل سنت کے فہم،ان کی آراء،اور ان کے اقوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔اس لئے کہ ان کو شریعت سے اور شریعت کے کلی قواعد وضوابط سے یہ علم ہے کہ کون سی چیز خطاء سے بچانے والی ہے اور کون سی چیز راہِ انحراف یا لغزشوں سے محفوظ رکھنے والی ہے۔

سابقہ گزارشات سے آپ پر بخوبی واضح ہو گیا کہ ان ضوابط اور قواعد جن کا تذکرہ آگے آرہا ہے کی پابندی واجب ہے۔

اور آپ پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس کا کیا فائدہ ہے،اس کی پابندی کیوں واجب ہے،اور ان کی پابندی اور ان کی رعایت سے خود آپ کو اور آپ کی سوسائٹی کو کیا فوائد و مصالح حاصل ہوں گے۔

جو شخص کسی ہادی و رہبر کے پیچھے چلے اور دلائل کے مطابق زندگی گزارے تو اپنے اس سفر میں اور اپنی اس ہدایت و رہنمائی میں مبارکباد کا مستحق ہے، وہ یقیناً کبھی بھی اس پر نادم نہیں ہوگا۔

فتنہ کے ایام میں واجب الاتباع شرعی قواعد وضوابط

١) پہلا قاعدہ: (بردباری اور صبر و تحمل کا مظاہرہ اور عجلت سے گریز)

پہلا قاعدہ یہ ہے کہ فتنہ کے ظہور کے وقت اور حالات کی تبدیلی میں آپ کو نرمی و بردباری، تحمل اور صبر کا مظاہرہ کرنا ہوگا، جلد بازی اور عجلت پسندی سے گریز کرنا ہوگا۔

یہ بڑا اہم قاعدہ ہے کہ آپ نرم روی اپنائیں، غور وخوض کریں، صبر و تحمل سے کام لیں، یہ تین چیزیں ہیں۔

١۔ پہلی خصلت: رفق و نرمی سے کام لیں اس خصلت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے:

﴿وما کان الرفق فی شی الا زانہ، وما نزع من شی الا شانہ﴾

(کسی بھی چیز میں رفق اور نرمی اس کی زینت کا باعث ہے اور کسی بھی چیز سے رفق اور نرمی کا چھن جانا اس کے لئے عیب کا باعث ہے)

اہل علم کہتے ہیں کہ: (ما کان الفرق فی شی الا زانہ) کے جملہ میں لفظ (شی) نکرہ ہے، اس کا استعمال نفی کے سیاق میں ہوا ہے، اور عربی زبان کے قواعد کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء کو شامل ہو، یعنی رفق اور نرمی ہر کام میں پسندیدہ چیز ہے۔ صحیح بخاری میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: (ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ) (اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہر کام میں نرم روی اور مہربانی محبوب ہے۔)

آپ ﷺ نے یہ بات ام المؤمنین عائشہ بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا سے فرمائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں اس پر یہ باب باندھا ہے: (باب الرفق فی الامر کله) (ہر کام میں رفق ونرمی کا بیان۔)

آپ ہر معاملہ میں نرم روی اختیار کریں، ہر کام میں صبر وانتظار کی روش اپنائیں، نہ تو غیظ وغضب کا شکار ہوں اور نہ نرم روی کو خیر باد کہیں۔

رفق اور نرمی کی موجودگی میں آپ کو کبھی ندامت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ نرمی جس چیز میں بھی ہوگی اس کو آراستہ اور مزین کرے گی۔ افکار وخیالات میں، نقطہ نظر میں، ہر نئی چیز میں اور ہر اس چیز میں جس میں آپ کچھ فیصلہ کرنا چاہتے ہوں۔ اور ہر اس چیز میں جس کو آپ اختیار کرنا چاہتے ہوں۔

آپ رفق ونرمی کا رویہ اختیار کریں، جلد بازی نہ کریں، اگر جلد باز اور عجلت پسند لوگ جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہوں تو آپ ان کا ساتھ نہ دیں۔ عاجلانہ اقدام کرنے والوں سے بھی آپ کنارہ کش رہیں۔ ہمارے اور آپ کے نبی محمد ﷺ کے فرمان (وما کان الرفق فی شی الا زانه) کی پیروی کرتے ہوئے کہ آپ کو بس رفق ونرمی کا دامن پکڑے رہنا چاہیے۔

آپ عمدہ چیز کا انتخاب کریں اور آراستہ و پیراستہ چیز کو لیں، اچھی بات کو اپنائیں، ناشائستہ اور معیوب باتوں سے اجتناب کریں اور ایسا ہر گز نہ ہو کہ آپ کے قول وفعل سے ہر معاملہ میں رفق ونرمی مفقود ہو۔

۲۔ دوسری خصلت: عدمِ عجلت پسندی ہے، نبی اکرم ﷺ نے اشج عبدالقیس کو مخاطب کر کے فرمایا: (إن فيك لخصلتين يحبهما الله ورسوله: الحلم والأناة) (تم میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں: حلم وبردباری اور عدم عجلت پسندی)

عدم عجلت پسندی ایک قابل تعریف خصلت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ

نے ارشاد فرمایا:

﴿وَيَدْعُ الإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الإِنسَانُ عَجُولاً ﴾

(بنی اسرائیل:۱۱)

(انسان برائی کی دعائیں مانگنے لگتا ہے، بالکل اس کی اپنی بھلائی کی دعاء کی طرح، انسان ہے ہی بڑا جلد باز)

اہل علم کہتے ہیں کہ اس آیت میں انسان کی مذمت ہے، کیوں کہ وہ جلد باز ہے۔ جلد بازی کی خصلت جس شخص میں بھی ہوگی وہ قابل مذمت ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ جلد باز نہیں تھے۔

۳۔ تیسری خصلت حلم و بردباری ہے: فتنوں میں تحمل و بردباری، حالات کی تبدیلی میں تحمل مزاجی، بہت ہی قابل تعریف ہے۔اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اس لئے کہ تحمل مزاجی سے معاملات کو اس کی اپنی اصلیت اور حقیقت میں دیکھا جا سکتا ہے، اور حلم و بردباری سے اس بات کا امکان ہے کہ امور و معاملات کو اس کی اپنی اصلیت میں ہم جان لیں۔

صحیح مسلم میں لیث بن سعد موسیٰ بن عُلَیّ سے روایت کرتے ہیں اور موسیٰ اپنے والد عُلَیّ سے اور عُلَیّ مستورد قریشی سے روایت کرتے ہیں کہ مستورد کے پاس عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ مستورد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے:

﴿(تقوم الساعة والروم أكثر الناس) قال عمرو بن العاص له ، للمستورد القرشي :أبصر ما تقول! قال: وما لي أن لا أقول ما قاله رسول الله ﷺ؟ قال إن كان كذلك فلأن في الروم خصالا أربعا: الأولى : أنهم أحلم الناس عند الفتنة، الثانية: أنهم أسرع الناس إفاقة بعد مصيبة۔۔۔۔﴾

((قیامت بپا ہوگی، اس وقت لوگوں میں اکثریت اہل روم کی ہوگی) عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مستورد قریشی رضی اللہ عنہ سے کہا: سوچو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مستورد نے عرض کیا

کہ میں وہ بات کیوں نہ کہوں جس کو رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر یہ بات ایسی ہی ہے جیسے تم کہتے ہو تو یہ اس واسطے ہے کہ رومیوں میں چار خصلت پائی جاتی ہے:

پہلی خصلت یہ ہے کہ فتنہ وفساد اور آزمائش کے وقت میں وہ سب سے زیادہ متحمل مزاج ہوتے ہیں۔

دوسری خصلت یہ ہے کہ مصیبت اور صدمہ کے بعد وہ سب سے پہلے اس حالت سے نکل جاتے ہیں، اور بقیہ مزید دو خصلتیں ذکر کیں، اور ایک پانچویں خصلت کا بھی اضافہ کیا)

اہل علم کہتے ہیں کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی اس بات سے اہل روم اور کافر نصاری کی تعریف نہیں کر رہے ہیں، ہر گز نہیں، بلکہ آپ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ مسلمانوں پر واضح کریں کہ روم کی بقاء اور تا قیامت ان کا اکثریت میں ہونا اس وجہ سے ہے کہ وہ فتنہ وفساد کے موقع پر سب سے زیادہ متحمل مزاج ہوتے ہیں، اور ان کی یہ بردباری اور تحمل مزاجی انہیں اس بات کا اہل بناتی ہے کہ وہ معاملات پر غور وخوض کریں اور ان کا حل نکالیں تاکہ نہ وہ ناپید ہوں اور نہ ان کے ساتھی ختم ہوں۔ (صحیح مسلم کی شرح میں سنوسی اور اُبّی کے فرمودات کا یہ ماحصل ہے)

یہ بڑی لطیف تنبیہ ہے اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان فرمایا "لا تقوم الساعة حتی یکون الروم أکثر الناس" (قیامت نہیں قائم ہوگی یہاں تک کہ رومیوں کو اکثریت حاصل ہو جائے۔)

یہ کیوں ؟اس کا جواب عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے دیا کہ رومیوں میں چار خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ ان خصلتوں میں پہلی خصلت جو ہمارے لئے اس مقام پر اہمیت کی حامل ہے، یہ ہے کہ وہ فتنہ وفساد کے موقع پر سب سے زیادہ بردبار اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ یعنی حالات کی تبدیلی کے وقت اور فتنوں کے ظہور کے وقت وہ بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں، عجلت پسندی

سے کام نہیں لیتے اور غصہ نہیں ہوتے تاکہ اپنے نصرانی ساتھیوں کو قتل سے بچالیں اور ان کو فتنوں سے دور رکھیں، کیوں کہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ جب فتنہ برپا ہوگا تو وہ بھی اس کا شکار ہوں گے۔اس لئے اپنی اس خصلت کی وجہ سے قیامت تک وہ اکثریت میں ہوں گے۔

اس لئے ہمیں اس بات پر تعجب ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رومیوں کی جس خصلت کی تعریف فرمائی ہے ہم اس کو کیوں نہیں اختیار کرتے ،اصل میں یہ قابل تعریف خوبی تھی جب کہ اغیار کی ہر خوبی اور بھلائی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

بردباری ہر معاملہ میں قابل ستائش و قابل تعریف وصف ہے۔ بردباری کی خصلت عقل مند کی عقل میں فتنوں کے وقت بصیرت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ بردباری، صبر اور رفق و نرمی کی روشنی میں فیصلہ کرے،اوراس میں اس کی عقل و بصیرت کی دلیل پائی جاتی ہے۔

یہ پہلا ضابطہ ہے، اہل سنت والجماعت نے فتنہ کے ظہور اور حالات کی تبدیلی کے وقت اس ضابطہ کی پیروی کی ہے۔

ان ضوابط اور قواعد میں بعض کا تعلق قاعدہ سے ہے۔اور بعض ضابطے کے قبیل سے ہے۔ معنی اور مفہوم میں باہم اشتراک کی وجہ سے سب کو میں نے ایک ساتھ بیان کر دیا ہے۔

۲)دوسرا قاعدہ :"الحکم علی الشی فرع عن تصورہ" یعنی (کسی چیز پر حکم لگانا اس کے تصور کی فرع ہے۔)

اس قاعدہ کی رعایت کرتے ہوئے حالات کی تبدیلی اور فتنہ و فساد کے برپا ہونے کی صورت میں صحیح صورت حال کو جانے اور اس کا صحیح تصور کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ کسی چیز پر حکم لگانا اس کی صحیح صورت حال سے واقفیت کی شاخ ہے۔(الحکم علی الشی فرع عن تصورہ)

اس قاعدہ کی رعایت اور اس کا خیال اسلام سے پہلے اور عہد اسلام میں سارے اربابِ عقل ودانش نے کیا ہے، ہمارے نزدیک اس کی شرعی دلیل کتاب اللہ میں یہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ﴾ (بنی اسرائیل:۳۶)

(جس بات کی تمہیں خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑو)

یعنی جو معاملہ آپ نہ جانیں او آپ کے پاس اس کا صحیح تصور نہ ہو اور نہ اس کی دلیل سے واقفیت ہو تو اس میں لب کشائی اور کسی قسم کی گفتگو سے پرہیز کریں اور اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آپ اس میں قائد ورہنما یا حکم بنیں۔

کسی چیز پر حکم لگانا اس کے تصور کی شاخ ہے، اس قاعدہ کو آپ اپنے عام امور و معاملات میں استعمال کرتے ہیں۔ مختلف احوال و کوائف میں بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔ عقل کے لئے اس قاعدہ کی رعایت ضروری ہے، کوئی بھی اقدام اور تصرف اس قاعدہ کی رعایت کے بغیر نامناسب ہے۔ اس لئے کہ اگر اس قاعدہ کی رعایت نہیں کی گئی تو عقل یقینی طور پر غلطی کرے گی۔ شریعت نے اس قاعدہ کو کتنے ڈھنگ اور قرینے سے ثابت کیا ہے۔ اور کتنے عمدہ طریقے سے اس کی وضاحت کی ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے میں یہاں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً اگر میں کسی سے سوال کروں اور اس سے یہ کہوں کہ بیع مرابحہ کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟ تو کوئی کہنے والا آکر یہ کہہ سکتا ہے کہ نفع مطلوب و مقصود چیز ہے، شریعت میں نفع میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں۔ پس بیع مرابحہ میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں۔ تو اس شخص کا اس مسئلہ میں یہ حکم اور فیصلہ سراسر غلط ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے بیع مرابحہ کا معنی بیع میں ربح اور نفع سمجھا اور اپنے اس غلط تصور کی بنا پر اس کے شرعی حکم میں غلطی کی، اس لئے ضروری ہے کہ شرعی حکم کی بنیاد صحیح تصور پر قائم ہو۔ مرابحہ بیع کی ایک ناجائز قسم ہے۔ بعض اسلامی اور غیر اسلامی بینک سود کے لئے بطور حیلہ اس کو استعمال کرتے

ہیں۔اس کی صورت یہ ہے کہ اس بیع میں دوسرا آدمی وکیل بنتا ہے اس توکیل کے بعد ایفاءِ عہد لازم ہوتا ہے، پس موکل نے اپنے وکیل سے جو وعدہ کیا ہے وہ اس کے ایفاء کا پابند ہے اور یہ شرع میں ناجائز ہے۔لہٰذا بیع مرابحہ ناجائز ہوئی۔

دوسری مثال جو اس قاعدہ(کسی چیز پر حکم لگانا اس کے تصور کی فرع ہے) کی مزید وضاحت کرتی ہے۔یہ ہے اگر میں کسی سے سوال کروں کہ شہود یہوہ کی جماعت پر ہم کیا حکم لگائیں گے؟ تو ایسی صورت میں اس کا کیا جواب ہوگا؟ اگر اس سلسلے میں وہ واقف کار ہوگا تو کہے گا کہ یہ جماعت ایسی ہے اور ایسی ہے،اور اسلام کا یہ حکم ہے اور وہ حکم ہے۔اس کے بارے میں یہ اور کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے میرے پاس شہود یہوہ کی جماعت کے بارے میں معلومات نہیں ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ کون سی جماعت ہے۔اس سے پہلے اس جماعت کے بارے میں کچھ سنا نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس جماعت پر آپ کوئی حکم نہیں لگا سکتے ،نہ ہی ان کے بارے میں کسی شرعی حکم کی وضاحت کر سکتے ہیں۔اس لئے کہ اس جماعت کے بارے میں آپ کے پاس کوئی تصور نہیں کہ یہ کون سی جماعت ہے؟ اس کے اصول ومبادی کیا ہیں؟ کیا یہ اسلامی جماعت ہے؟ یا یہ نصرانی، یا یہودی جماعت ہے، آپ اس پر اس وقت تک کوئی حکم نہیں لگا سکتے، جب تک کہ آپ پر صورتِ حال واضح نہ ہو جائے۔

اس وضاحت کے بعد اپنی ذات کے حق کی رعایت کرتے ہوئے اور اپنے کو گناہوں سے دور رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے اور اللہ پر بلا علم ومعرفت گفتگو سے بچتے ہوئے کسی قاضی یا مفتی یا شرعی مسائل پر گفتگو کرنے والے کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو چیزوں کے متحقق ہونے سے پہلے لب کشائی کرے۔ان دو چیزوں کے حاصل کرنے سے پہلے زبان کھولنا ناجائز ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ زیرِ بحث مسئلہ کا پورا تصور وادراک ہو، تاکہ وہ دوسرے مسئلہ سے

گڈ مڈ نہ ہو، اور اپنے اس فہم و تصور میں دوسرے مسئلہ سے مشترک بھی نہ ہو۔ اس لئے کہ کبھی بعض مسائل مشترک ہوتے ہیں، اور ایک مسئلہ کی صورت دوسرے مسئلہ کی صورت سے قریب ہوتی ہے۔ تو آپ کا ذہن اصل مسئلہ سے مشابہ مسئلہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اور ایسی صورت میں غلطی واقع ہو جائے گی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ بعینہ زیر نظر مسئلہ کے بارے میں آپ کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلہ کا علم ہو۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے، آپ میں سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے کس طریقہ سے مسئلہ کا تصور و ادراک ہو؟ یا میں اس مسئلہ کا تصور کیسے کر پاؤں؟ اور کس سے اس صورت حال کی وضاحت ہو؟ مسائل ایک طرح سے ہیں اور باہم مشابہ ہیں، بعض مسائل مشکل اور پیچیدہ ہیں، اور بعض مسائل کے بارے میں مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جو مجھ سے ان کی وضاحت کرے، اور میرے سامنے ان کی سچی اور واقعی تصویر پیش کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ مسئلہ کے جس تصور و ادراک پر شرعی حکم کی اساس ہو گی اس کا تعلق سب سے پہلے سائل (مستفتی) سے ہو گا۔ سائل صاحبِ مسئلہ ہے، تو اس کے سوال اور مسئلہ کی شرح و تفسیر کے وقت مسئلہ کا تصور حاصل ہو گا۔ اور مفتی استفتاء کے مطابق سائل کو فیصلہ بتائے گا۔

مسئلہ کے تصور کی دوسری صورت ایسے ثقہ عادل مسلمان کی نقل و روایت ہے جن کی روایت میں کوئی ایسا شبہ نہ پایا جائے کہ وہ نقل میں غلطی کر رہے ہیں اور نتیجتاً ہم بھی فیصلہ میں غلطی کر بیٹھیں۔ ضروری ہے کہ مسئلہ کو بیان کرنے والے عادل اور ثقہ ہوں۔

اس لئے فتنوں کے ظہور اور حالات کی تبدیلی میں یہ جائز نہیں کہ ہم کسی کافر کی بات

پر اعتماد کریں، جس نے اپنے نقطہ نظر یا جائزہ کو کسی ریڈیو اسٹیشن پر نشر کیا ہو یا اپنے اس تصور و نقطہ نظر اور تجزیہ کو کسی مجلّہ میں شائع کیا ہو یا کسی رپورٹ میں ان امور کا تذکرہ کیا ہو، تو شرعاً یہ ناجائز ہے کہ ہم ایسی معلومات اور تجزیوں کو شرعی حکم کی بنیاد بنائیں۔

شرعی فیصلہ کی بنیاد صرف ثقہ عادل مسلمان کی روایت ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ میں شروع سند سے آخر سند تک عادل وضابط ثقہ رواۃ کی روایت کے علاوہ کسی کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی، جب سلسلۂ اسناد میں کوئی فاسق ہو تو اس کی ثقاہت مجروح ہو گی۔ اگر اسناد میں کوئی ایسا راوی ہو جو حفظ وضبط میں ناپختہ اور کچا ہو یا سہو واختلاط کا شکار ہو تو وہ غیر مقبول ہو گا۔ ایسی حدیث پر شرعی حکم کی بنیاد نہیں رکھی جائے گی، اس لئے اس مسئلہ کی رعایت اور لحاظ ضروری چیز ہے۔

خاص ہ کلام یہ کہ ''الحکم علی الشی فرع عن تصورہ'' (کسی چیز پر حکم لگانا اس کے تصور کی فرع ہے) کے قاعدہ کی اساس تصور ہے، اور شریعت میں اس وقت تک اس تصور کے صحیح ہونے کا امکان نہیں ہے۔ جب تک کہ یہ عادل ثقہ مسلمان کی طرف سے نہ ہو، یا سائل اور مستفتی کی طرف سے ہو چاہے وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو۔

۳) تیسرا قاعدہ: (معاملات میں عدل وانصاف کی پاسداری)

تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے سارے معاملات میں عدل وانصاف کا پابند ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ﴾ (الانعام: ۱۵۲)
(اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو)

نیز ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾

(المائدہ:۸)

(کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کردے ،تم معدل کیا کرو، وہ پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے)

اس مسئلہ کی بہت اچھی طرح سے وضاحت ہو چکی ہے کہ گفتگو میں عدل وانصاف کی پابندی ضروری ہے،احکام اور فیصلوں میں عدل وانصاف کا خیال ضروری ہے۔ جس شخص نے اپنے قول یا فیصلہ میں عدل وانصاف نہیں کیا،اس نے شریعت کی ایسی اتباع و پیروی نہیں کی جس سے اس کو آخرت میں نجات کی توقع ہو۔

اس قاعدہ میں عدل وانصاف کا کیا معنی ہے؟عدل وانصاف کا معنی یہ ہے کہ آپ اچھے اور برے امور و معاملات کو جمع کریں۔ مسئلہ کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو سامنے لے آئیں۔ پھر ایک دوسرے کا موازنہ کریں،اور دونوں کا یکساں جائزہ لیں،اس کے بعد فیصلہ کریں،اس لئے کہ مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ رکھ کر اس کا جائزہ لینے کی صورت میں یقینی طور پر فائدہ حاصل ہوگا کہ آدمی شریعت الٰہی کی طرف یااللہ تعالیٰ کی طرف، یااللہ تعالیٰ کی سنن کونیہ(کائناتی سنت) میں سے کسی سنت کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کرے گا،جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مخالف ہو۔

اس لئے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو اپنے ذہن و دماغ پر پیش کرنا ضروری ہے ،تاکہ آپ شرعی نتیجے تک پہنچ سکیں اور تاکہ آپ کا تصور وخیال،آپ کی بات،آپ کا فہم،آپ کا کام اور آپ کی رائے فتنہ میں نجات دینے والی ہو،ان شاءاللہ۔

یہ بڑا اہم مسئلہ اور ایسا قاعدہ ہے جس کی رعایت ضروری ہے،اس لئے جس نے اس قاعدہ کی رعایت نہیں کی خواہشاتِ نفس اس کے دل میں چوپٹ دروازوں سے جا گھسے گی۔اور دوسروں کے لئے بھی خواہشِ نفس کے دروازے کھولنے کے خطرے سے مامون نہ رہے گا، اور ایسی صورت میں وہ رسول اللہ ﷺ کے درج ذیل قول کا مصداق ہوگا:

’’ومن سن سنة سيئة فعليه وزرها ووزر من عمل بها إلى يوم القيامة‘‘

(جس شخص نے کوئی براطریقہ ایجاد کیا تو اس پر اس کا گناہ اور جس شخص نے اس پر عمل کیا ہے اس کا بھی گناہ تا قیامت ہوگا)

یہ مصیبت اس وقت زیادہ بڑی اور سنگین ہو جاتی ہے جب یہ کام علم و ہدایت سے منسوب لوگوں کا ہو، اس لئے کہ جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگ انہی کے فعل کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے سارے معاملات میں اس قاعدہ کا لحاظ رکھیں، جو شخص نفس سے بچا رہا اسے اللہ تبارک و تعالیٰ دنیا و آخرت میں نجات دے گا۔

۴) چوتھا قاعدہ: (اتحاد و اتفاق کی پاسداری اور اختلاف و انتشار سے اجتناب)

چوتھا قاعدہ جس کی دلیل اللہ رب العزت کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعًا وَلاَ تَفَرَّقُواْ﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

(اللہ تعالیٰ کی رسی (دین) کو سب مل کر مضبوط تھام لو، اور پھوٹ نہ ڈالو)

اس آیت کی رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں یوں وضاحت فرمائی:

’’عليكم بالجماعة وإياكم والفرقة‘‘

(اے مسلمانو! تم جماعت کے ساتھ ہو لو، اور اختلاف سے دور رہو)

نیز حدیث میں یہ ثابت ہے جسے عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند احمد میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’الجماعة رحمة والفرقة عذاب‘‘

(جماعت (اجتماعیت) رحمت اور افتراق عذاب ہے)

ہر طرح کے اختلافات خواہ وہ افکار و آراء کے ہوں یا اقوال و اعمال کے، سب عذاب ہیں۔ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی، اس کے طریقے سے رو گردانی کی تو اللہ

تبارک وتعالیٰ اس کو اس عذاب سے دوچار کرے گا۔

اس لئے جس شخص نے جماعت سے یعنی اہل سنت والجماعت سے اپنا تعلق جوڑے رکھا، اور ان کے علماء اور ائمہ کی اقتداء کی تو اس نے جماعت کو پکڑے رکھا، اور جس شخص نے ان سے اختلاف کیا تو اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ افتراق وانتشار کی راہ پر چل پڑا ہے۔ اسے دنیاوی زندگی میں اللہ کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، ہم اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اور ہمارے تمام بھائیوں کو افتراق وانتشار اور اس کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ آمین

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''الجماعة رحمة والفرقة عذاب''

(جماعت (اجتماعیت) رحمت اور افتراق عذاب ہے)

جماعت (اجتماعیت) اپنی ساری انواع واقسام، اور ساری صفات وخصوصیات کے ساتھ حق اور ہدایت پر ہوگی تو وہ سراپا رحمت ہے، اللہ رب العزت اس کے ذریعہ اپنے بندوں پر رحم فرماتا ہے۔

اور اختلاف وافتراق عذاب ہے، اس میں خیر اور بھلائی کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ﴿وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعًا وَلاَ تَفَرَّقُواْ﴾ (آل عمران: ۱۰۳) کے بعد یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (آل عمران: ۱۰۴)

(تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں)

پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلاَ تَكُونُواْ كَالَّذِينَ تَفَرَّقُواْ وَاخْتَلَفُواْ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُوْلَـئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (آل عمران: ۱۰۵)

(تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آجانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، انہیں لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے)

ہاں! جن لوگوں نے دلائل و براہین اور صحیح طریقہ کے آجانے کے بعد اپنے اقوال و افعال میں اختلاف و افتراق کا طریقہ اپنایا تو خطرہ ہے کہ وہ کج روی کا شکار ہو جائیں۔ اختلاف و افتراق میں پڑ جائیں اور راہِ ہدایت سے دور ہو جائیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم اہل سنت والجماعت سے اپنا تعلق مضبوط کر لیں، ان کے اقوال کو اپنے اوپر لازم کر لیں، ان کے قواعد و ضوابط اور ان کے علماء کے مقرر کردہ اصول و ضوابط سے باہر نہ جائیں، اس لئے کہ یہ علماءِ اہل سنت والجماعت کے اصول و ضوابط اور شرعی دلیلوں کا وہ علم رکھتے ہیں جو لوگوں کی اکثریت بلکہ علم سے نسبت رکھنے والے اکثر لوگوں کے پاس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ علماء پختہ علم رکھتے ہیں، اصابتِ رائے کے مالک ہیں اور علم میں انہیں بڑا رسوخ حاصل ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر غور کیجئے جس وقت انہوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو کیا کیا تھا؟ عثمان رضی اللہ عنہ ایام حج میں منیٰ میں فرض نمازیں پوری پوری چار چار رکعتیں پڑھتے تھے، جب کہ سنت یہ ہے کہ منی میں نمازی چار رکعت والی نمازوں کو دو دو رکعت (قصر) پڑھے، عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک شرعی تاویل کی بنا پر قصر والی یہ نمازیں چار چار رکعتیں پڑھیں، اس پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ منی میں چار رکعت والی نمازوں کو دو پڑھا جائے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ یہ

کہتے ہیں اور پھر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ چار چار رکعتیں پڑھتے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟آپ نے جواب دیا: اے فلاں! اختلاف بری بات ہے،اختلاف بری بات ہے،اختلاف بری بات ہے۔اس حدیث کوامام ابوداؤد نے قوی سند سے روایت کیاہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ روش صحیح قاعدہ کے سمجھنے کی وجہ سے اختیار کی تھی تو جو شخص اس ضابطہ کی مخالفت کرے گا تو وہ خود اور دوسرے لوگ فتنے کے اندیشہ سے باہر نہیں رہیں گے ،ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''اختلاف بری بات ہے''۔

۵)پانچواں قاعدہ:(امور و معاملات کو شرعی میزان سے پرکھنا)

پانچواں قاعدہ یہ ہے کہ فتنہ وفساد کے ایام میں جو جھنڈے بلند کئے جاتے ہیں چاہے وہ حکومتوں کے ہوں، یا دعاۃ و مبلغین کے ،ان کو شرع کی صحیح میزان اہل سنت والجماعت کی میزان پر تولنا ضروری ہے ۔اس میزان سے جو بھی تولے گا اس کی تول عادلانہ اور درست ہوگی، اور اس کی میزان کسی طرف مائل نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنی میزان کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ﴾ (الأنبياء:۴۷)

(قیامت کے دن ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو کو درمیان میں لا رکھیں گے ، پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا)

ایسے ہی اہل سنت والجماعت کی میزان عدل ہے جس پر وہ معاملات کو پرکھتے ،افکار اور آراء کو تولتے اور احوال و ظروف کا موازنہ کرتے ہیں، حالات کی تبدیلی کے وقت مختلف جھنڈوں کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ میزان کئی طرح کی ہوتی ہیں، جیسا کہ ہمارے ائمہ دعوت اور ائمہ اہل سنت والجماعت نے وضاحت فرمائی ہے ،ان میزانوں کی دو قسمیں ہیں، غور سے سنیں۔

ا۔ پہلی قسم:

پہلی قسم کی میزان سے اسلام اور عدمِ اسلام کا وزن کیا جاتا ہے، یعنی اسلام کے دعوے کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کی جاتی ہے۔

اسلام کے نام پر اور اسلام سے منسوب بہت سے جھنڈے ہیں، اس لئے ان کی تول پرکھ ضروری ہے۔ اگر یہ جھنڈا اسلامی ہو تو اس پر شرعی احکام مرتب ہوں گے، جن کی رعایت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو تسلیم کرتے ہوئے ضروری ہے۔

۲۔ دوسری قسم:

دوسری قسم ایسی میزان کی ہے جس سے ہم اسلام کے کمال کو ناپتے ہیں۔ اسلام پر حقیقی استقامت اور عدم استقامت کو معلوم کرتے ہیں۔

پہلی قسم کی میزان سے کفر وایمان کے مابین امتیاز ہوتا ہے کہ یہ جھنڈا اسلامی ہے، یا یہ جھنڈا اسلامی نہیں ہے۔

دوسری قسم کی میزان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آیا یہ جھنڈا اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر مبنی ہدایت کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، یا اس کی استقامت اور سلامت روی میں کمی ہے، پھر جب یہ واضح ہو گیا تو اس میزان پر شرعی احکام مرتب ہوتے ہیں۔

پہلی قسم جس میں ایمان و کفر کی جانچ ہوتی ہے یہ تین میزان پر مشتمل ہے۔

پہلی میزان یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ آیا اس جھنڈا کے تحت اللہ کی عبادت اور الوہیت کا حق ادا کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ انبیاء ورسل کے دین کی حقیقت اور ان کی بعثت کا مقصد صرف اللہ رب العزت کی عبادت ہے جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

توحید اساسی اور بنیادی چیز ہے، اسی کو اولیت حاصل ہے، اور یہی حرف آخر ہے۔ تو جس

شخص نے توحید کا جھنڈا بلند کیا، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کا اقرار کیا اور غیر اللہ کی عبادت کا منکر ہوا، تو اس میزان کے نتیجہ میں وہ آدمی مسلمان ہے، اور اس کا جھنڈا اسلامی ہے۔ بشرطیکہ وہ ان دونوں میزانوں پر بھی پورا اترے جو عنقریب آپ سنیں گے۔ ان شاء اللہ

تو پہلی میزان یہ ہے کہ ہم اسلام کے نام پر بلند کئے جانے والے جھنڈوں کے بارے میں یہ دیکھیں کہ اس کے علمبردار توحید کے تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں یا نہیں۔ کیا ان کے یہاں غیر اللہ کی عبادت ہو رہی ہے یا اس جھنڈے تلے صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت ہو رہی ہے۔ اور دل صرف ایک اللہ کی طرف یکسو ہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ﴾ (النحل:۳۶)

(ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ (الحج:۴۱)

(یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جمادیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں، زکاۃ دیں، اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں اور تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے)

بعض مفسرین نے ﴿وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ﴾ کی تفسیر توحید سے اور ﴿وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ﴾ کی شرک کی ہے۔ اس لئے کہ اعلیٰ ترین معروف "توحید" ہے، اور بدترین منکر "شرک" ہے، یہ پہلی میزان ہے۔

دوسرا میزان یہ ہے کہ آپ دیکھیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اللہ کے رسول ہونے کی

گواہی محقق ہوئی یا نہیں، اور اس گواہی کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ آپ ﷺ جو شریعت لے کر آئے ہیں اس کا نفاذ ہو، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿ فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ ﴾ (النساء: ٦٥)

(سو قسم ہے تیرے رب کی ! یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناراضگی نہ پائیں، اور فرمانبر داری کے ساتھ قبول کر لیں)

اور ارشاد ہے:

﴿ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴾ (المائدہ: ٥٠)

(کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے)

اور ارشاد ہے:

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ﴾ (المائدہ: ٤٤)

(جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں)

پس جب آپ یہ دیکھیں کہ جھنڈا اٹھانے والے لوگ شریعت کا نفاذ کر رہے ہیں، لوگوں کے مابین نزاعی مسائل میں شریعت کا فیصلہ نافذ ہو رہا ہے۔ اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے والے کون لوگ ہیں۔ یہ شرعی قاضی اور جج ہیں جو نزاعی مسائل میں فیصلہ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھنڈا اسلامی ہے، کیوں کہ اس کے علم برداروں نے اللہ کی شریعت کا نفاذ کر رکھا ہے۔ شرعی عدالتیں قائم کر رکھی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام و فرامین کے مطابق فیصلہ کرتی ہیں۔ یہ کتاب و سنت کے علاوہ کسی اور فیصلہ کو کسی پر لاگو نہیں کرتیں۔

تیسری میزان یہ ہے کہ آپ یہ دیکھیں کہ کیا حرام کو حلال و مباح سمجھا جارہا ہے، یا حرام کے ارتکاب کو نفرت و کراہت کی نظر سے دیکھا جارہا ہے، اور اس پر نکیر ہو رہی ہے، کیوں کہ متفق علیہ حرام امور کے ظہور پذیر ہونے کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ کہ اس کا ارتکاب حلال سمجھ کر کیا جائے تو یہ کفر ہے۔ اللہ کی پناہ۔

دوسری صورت یہ کہ ان کا ارتکاب حلال و مباح سمجھ کر نہ کیا جائے، لیکن معاشرے میں ان کا وجود ہو، اور اسلامی جھنڈا لہرانے والے لوگ اس کے منکر اور حرام ہونے کے قائل ہوں تو ایسی صورت میں یہ جھنڈا شرعی اور اسلامی مانا جائے گا۔

یہ تین میزان ہیں جن کی وضاحت ہمارے ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، یہ موازین کی پہلی قسم ہوئی۔

موازین کی دوسری قسم وہ ہے جن کے ذریعہ اسلام کے کمال وعدمِ کمال کو جانا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کو رسول اللہ ﷺ نے پورے طور پر اپنایا، آپ ہمارے امام اور مقتدیٰ ہیں۔ آپ کی اقتداء کی جائے گی، خلفاء راشدین نے بھی پورے اسلام کو اپنایا، بعد میں مکمل اسلام کی تعمیل میں برابر تھوڑی تھوڑی کمی آتی رہی۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

﴿ولا یأتی علی الناس زمان إلا والذی بعدہ شر منہ حتی تلقوا ربکم﴾
(لوگوں پر آنے والا ہر زمانہ سابقہ زمانے سے بدتر ہوگا، حتی کہ تم اپنے رب سے آملو)

اس میزان پر آپ غور کریں کہ شرعی امور کے نفاذ و تحقیق میں وہ میزان کیسی ہے؟ نمازوں کا حکم دینے میں وہ کیسی ہے؟ منکرات و فواحش سے روکنے میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ فرائض و واجبات سے متعلق امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں وہ کیسی ہے؟ اور محرمات سے روکنے میں اس کا کیا کردار ہے؟ اگر ان سب چیزوں میں یہ میزان کامل ہے تو یہ اس کے کمال کی دلیل ہے اور اگر اس میزان میں نقص ہے تو اسی کے مطابق اس کمی کی نشاندہی ہو جائے گی۔

یہ اہم میزان ہیں، ان کا آپ کے دل و دماغ میں رچ بس جانا نہایت ضروری ہے، یہ کسی صورت میں آپ سے جدا نہ ہونے پائیں تا کہ آپ گمراہیوں کے رونما ہونے کی صورت میں گمراہ نہ ہوں۔اور معاملات جب گڈ مڈ ہونے لگیں تو کسی شک وشبہ کا شکار نہ ہوں۔

آپ پر جب یہ بات واضح ہو گئی اور اسلامی جھنڈے اور غیر اسلامی جھنڈے میں تمیز ہو گئی تو شرعاً آپ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حق وہدایت میں آپ اسلامی جھنڈے تلے آ جائیں، اور اس کی مکمل رعایت اور تائید کریں، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہل ایمان سے دوستی و موالات کا حکم دیا ہے، اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لینے یعنی اتحاد و اتفاق کی پاسداری پر زور دیا ہے، اور انتشار وافتراق (گروہ بندی) سے منع کیا ہے۔

اس سلسلہ کی پہلی بات یہ ہے کہ اس جھنڈے سے آپ کی دوستی اور وفاداری صحیح ہو۔ آپ ایسے خیمہ میں ہوں جو اسلام کا صحیح طور پر علمبردار ہو، اس میں کسی طرح کی کوئی کجی اور شک و شبہ نہ ہو۔اس لئے کہ یا تو اسلام ہے یا کفر اور اسلام کے ثابت اور محقق ہونے کی صورت میں شرعی احکام اسی پر مرتب ہوں گے ،اور پھر کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہ ہو گا کہ وہ گناہ اور معصیت کا بہانہ بنا کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق اہلِ ایمان اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں سے موالات اور دوستی کی پابندی اور پاسداری نہ کرے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اسلامی جھنڈے سے آپ کا مخلصانہ اور خیر خواہانہ تعلق ایسا ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اسے جانتا ہے۔

اہل سنت والجماعت اختلاف وافتراق پسند کرنے والے اہلِ بدعت سے اس امر میں بالکل جدا اور مختلف ہیں، یہ اپنے حکمرانوں کے مخلص و خیر خواہ ہوتے ہیں، ان کے حق میں بکثرت دعائیں کرتے ہیں۔اگرچہ وہ حکمرانوں کے یہاں ایسی چیزوں کا مشاہدہ کریں جو انہیں نا پسند ہوں۔ پھر بھی وہ اپنے حکمرانوں کو خوب دعائیں دیتے ہیں، ان سے خیر خواہی کا معاملہ اس

بنیاد پر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے اس کا نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح معنوں میں دل میں بیٹھ جائے تو ہمارا شمار حقیقی طور پر اہل سنت والجماعت میں ہو گا۔

آپ جب اہل سنت والجماعت کے عقائد کی کتابوں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس میں رعایا پر امام (حکمراں) کے حقوق اور امام (حکمراں) پر رعایا کے حقوق سے متعلق خصوصی ابواب ملیں گے، کیوں کہ انہی حقوق کی رعایت سے اجتماعیت ملتی ہے اور سنت اور جماعت کے ارد گرد اجتماع نصیب ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ ائمہ سے خیر خواہی اور تمام لوگوں سے خیر خواہی کا تعلق رکھیں، ارشاد فرمایا: ''الدین النصیحة'' ''دین خیر خواہی کا نام ہے''۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خیر خواہی اور نصیحت واجب ہے اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خیر خواہی اور نصیحت کا رویہ اختیار کرے، تو یہ خیر خواہی اور نصیحت کیسے ہو؟ اور اس کی وضاحت کیسے ہو؟ یہ سب اس بنیاد پر ہو جو سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے۔ اس میں ہماری اور آپ کی مرضی کا کوئی دخل نہ ہو، صحیح حدیث میں ہے کہ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے نہیں سنا:

''من أراد أن ينصح لذی سلطان فلا يبده علانية، ولكن ليأخذ بيده ثم ليخل به، فإن قبل منه فذالك، وإلا فإنه أدى الذی عليه''

(جو کسی صاحبِ منصب واقتدار کو نصیحت کرنا چاہے تو ایسا اعلانیہ و کھلم کھلا نہ کرے، بلکہ اسے چاہئے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے تنہائی میں بات کرے، اگر سلطان اس کی نصیحت قبول کر لے تو یہی حاصلِ مقصد ہے، اور اگر نہ قبول کرے تو نا صحیح وہ بہر حال اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا)

اس حدیث کو ابن ابی عاصم نے کتاب السنہ میں روایت کیا ہے اور شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت مبارکہ کو سنیں، یقیناً اہل سنت والجماعت کی طرح آپ کو بھی سنت کا حرص واہتمام ہوگا۔

سابقہ معیاروں اور میزانوں سے اسلامی جھنڈا غیر اسلامی جھنڈے سے ممتاز و منفرد ہو گیا۔ تو اس جھنڈے پر شرعی حقوق بھی عائد ہو گئے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ جھنڈا اسلامی ہے، غیر اسلامی نہیں۔

انہی امور میں سے یہ اہم بات جس کی اہمیت فتنوں کے برپا ہونے اور حالات کی تبدیلی کے وقت ظاہر ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

''ومن أراد أن ينصح لذي سلطان فلا يبده علانية، ولكن ليأخذ بيده، وليخل به، فإن قبل منه فذاك، وإلا، فيكون قد أدى الذي عليه''

(جو شخص صاحبِ اقتدار و منصب کو نصیحت کرنا چاہے تو ایسا کھلم کھلا نہ کرے۔ بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تنہائی میں نصیحت کرے، اگر وہ یہ نصیحت قبول کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہو گیا)

یہ حدیث ہم میں اطمینان و سکون پیدا کرتی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی متبع بناتی ہے، اگر ہم اس نصیحت کو مان لیں تو اللہ کے حکم سے ہم نجات پانے والوں میں سے ہوں گے، اور اگر اس نصیحت کو نہ مانیں تو ہم کوتاہی کا شکار ہوں گے اور اپنی مخالفت کے بقدر اہل سنت والجماعت کے طریقہ کے مخالف ہوں گے۔

اس معیار کے بارے میں اگر مسلمان یا طالب علم کو التباس ہو جائے کہ وہ اس سے کس طرح معاملات کو پرکھے تو ایسی صورت میں علماء مرجع ہوں گے، صحیح معیار پر چیزوں کو

وہی تولیں گے ،اور ان کی تول صحیح ہوگی وہی صحیح شرعی حکم کے مطابق فیصلہ کریں گے۔اس لئے اسلام اور غیرِ اسلام ، کفر یا ایمان کے مابین فیصلہ میں علماءِ اہل سنت والجماعت کو مرجعیت حاصل ہوگی۔ جو بعض چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بعض چیزوں سے ناواقف ہیں یا بسا اوقات ان چیزوں کو وہ عموم کا درجہ دیتے ہیں جن کا عموم ناجائز ہے۔

توجو اہل علم صحیح میزان پر مسائل کو تولنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں،ان کے لئے ان امور میں حکم علماء ہیں۔ ہمارے لئے علماء کی باتوں کا ماننا،ایمان اور کفر کے امتیاز میں ان کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، نیز اوپر ذکر کئے گئے معیارات وموازین کا استعمال ضروری ہے۔

اہلِ سنت کے مقرر کردہ ان موازین پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ہر امام یا سلطان چاہے وہ نیکوکار ہو یا فاسق،اس کے جھنڈے تلے جہاد ہمیشہ کے لئے ہے۔ کسی کے لئے کسی بھی وقت یا کسی بھی زمانہ میں یہ جائز نہیں کہ وہ اس جہاد سے یہ بنیاد بنا کر پیچھے رہ جائے کہ حاکمِ وقت کے یہاں شرع کے مخالف امور پائے جاتے ہیں۔ آپ کے لئے ہر وقت اس ضابطہ کی پابندی ضروری ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ کی زندگی میں مستقبل میں ایسے معاملات آئیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے تو ایسے وقت میں اس اصول کی پابندی سے آپ اپنے معاملہ کو درست رکھ سکتے ہیں۔اور اپنے حالات اور اپنے افکار کو اس ترازو پر تول سکتے ہیں۔

حاکم کے لئے دعائے خیر:

انہی حقوق میں سے ان کے حق میں دعا کرنا ہے جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کا حاکم بنایا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ایک امام، ناصرِ سنت امام بربہاری اپنی ''کتاب السنۃ'' میں جو مطبوع اور متداول ہے۔ فرماتے ہیں (جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ سلطان کے حق میں دعا گو ہے تو جان لو کہ وہ صحیح عقیدہ والا، اور سنت پر چلنے والا ہے ،اور جب تم دیکھو کہ وہ سلطان کو بددعائیں دیتا ہے تو جان لو کہ وہ بدعتی ہے۔)

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سلطانِ وقت کے حق میں بکثرت دعائیں کرتے تھے۔ عباسی خلفاء کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنے عہد میں کیا کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود فضیل بن عیاض رحمہ اللہ ان کے حق میں بکثرت دعائیں کرتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ اپنے سے زیادہ ان خلفاء کے حق میں دعائیں کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہے، اس لئے کہ اگر میں درست اور ٹھیک ہو گیا تو اس کا فائدہ مجھے اور میرے ارد گرد کے لوگوں کو پہنچے گا، لیکن خلیفہ کے نیک وصالح ہونے کا فائدہ سارے مسلمانوں کو پہنچے گا۔

اس لئے جو شخص مسلمانوں کے لئے عام خیر اور فلاح کا ارادہ رکھے تو اسے مخلصانہ طور پر یہ دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن لوگوں کو مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا ہے، ان کی اصلاح فرمائے اور انہیں کتاب وسنت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری صرف یہی تمنا اور خواہش ہے کہ سارے اعمال اور ہدایتیں کتاب وسنت کے مطابق ہوں، دل اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔ وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے۔

۶) چھٹا قاعدہ: (قول وفعل میں محتاط رویہ)

فتنہ وفساد کے دور میں قول وفعل کے اصول وضوابط ہیں۔ ہر وہ بات جو آپ کو بظاہر اچھی لگے ضروری نہیں کہ ظاہر ہی کر دیں اور نہ ہر فعل جو آپ کو اچھا لگے اسے کر گزریں۔ کیوں کہ فتنہ کے بارے میں آپ کے بولنے پر کچھ چیزیں مرتب ہوں گی، ایسے ہی فتنہ کے بارے میں عملی اقدام پر کچھ چیزیں مرتب ہوں گی۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں کہ ہم ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنیں:

''حفظت من رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وعاءين: أما أحدهما فبثثته، وأما الآخر فلو بثثته لقطع هذا الحلقوم''

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو برتنِ علم محفوظ کئے ہیں، ایک برتن کے علم کو میں نے

شائع کردیا ہے، لیکن دوسرے برتن کے علم کو اگر میں ظاہر کردوں تو میری گردن کاٹ دی جائے گی) (صحیح بخاری)

اہلِ علم کہتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ یہ گردن کاٹ دی جائے گی، اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے فتنہ سے متعلق وارد احادیث اور بنی امیہ کے بارے میں وارد پیشین گوئیوں اور اس قبیل کی دیگر احادیث کو چھپالیا۔ آپ نے یہ بات امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں فرمائی۔

انتشار واختلاف اور جنگ وجدال کے بعد معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما پر مسلمانوں کا اتفاق ہو گیا تھا، اس موقع پر جو حالات پیش آئے آپ کو ان کا علم ہے۔ اس کی تاریخ معلوم ہے۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بعض احادیث کو پوشیدہ رکھا۔ ایسا کیوں؟ جب کہ وہ بھی احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں! احادیث رسول کے ہوتے ہوئے انہیں کیوں راز میں رکھا؟ ان کے بیان نہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق شرعی احکام سے نہیں تھا۔ بلکہ دوسرے امور سے تھا، ان امور کو آپ نے صیغۂ راز میں اس لئے رکھا تاکہ لوگوں میں فتنہ وفساد برپا نہ ہو۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کرنا حق ہے، اور کتمانِ علم ناجائز ہے۔ ایسا کیوں کیا؟ کیوں کہ ایسے وقت میں اس طرح کی پیشین گوئیوں کا چھپانا ضروری تھا تاکہ معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں پر عام الجماعہ یعنی اتفاق واتحاد کے سال میں لوگوں کے متحد ہو جانے کے بعد پھر ان میں دوبارہ اختلاف نہ پیدا ہو۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ما أنت بمحدث قوما حديثاً لا تبلغه عقلهم إلا كان لبعضهم فتنة''

(تم کسی قوم کو ان کی عقل وفہم سے اوپر کی کوئی بات کہوگے تو بعض لوگوں کے لئے یہ فتنہ وآزمائش ثابت ہوگی) (صحیح مسلم)

فتنوں میں واقع ہونے والے امور پر گفتگو کرنے والے کی ہر بات کا لوگ تصور و ادراک نہیں کر پاتے۔اس سے بعض ایسی باتیں سننے میں آسکتی ہیں، جو ان کی عقل و فہم سے اوپر ہوں، تو ان مسائل میں وہ اپنی فہم پر اعتقاد کی بنیاد رکھیں گے، اس کے مطابق تصرف کریں گے، یا ایسے احوال واقوال اور افعال کا ارتکاب کریں گے جن کا انجام خوشگوار نہیں ہو گا۔ اسی لئے سلف صالحین اس ضابطہ کی بہت زیادہ پابندی کرتے تھے۔

حسن بصری رحمہ اللہ کو دیکھیں کہ آپ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ پر اس وقت نکیر فرمائی جب انہوں نے حجاج بن یوسف سے قبیلہ عرینہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند لوگوں کو قتل کرنے کی حدیث بیان کی تو آپ نے انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ حجاج کو یہ حدیث کیوں سناتے ہیں؟

حسن بصری رحمہ اللہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ پر نکیر اس واسطے کی کہ حجاج خونریزی میں حد سے تجاوز کر گیا تھا تو وہ اس حدیث کو اپنے فعل کی تائید میں بطور تاویل کے پیش کرے گا، اس لئے تو ایسے وقت میں اس حدیث اور اس علم کو حجاج سے پوشیدہ رکھنا واجب تھا تا کہ اس کے عقل و فہم میں (جو کہ ناہموار اور غیر صحیح تھی) نہ سما جائے کہ یہ حدیث اس کے رویہ کی مؤید ہے۔ یا اس حدیث میں اس کے لئے دلیل ہے، تو وہ اس حدیث کو اس کے اصلی معنی سے ہٹ کر سمجھے۔

حسن بصری رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ پر یہ جانتے ہوئے کہ آپ صحابیِ رسول ہیں، حدیث کی روایت پر نکیر کی اور انس رضی اللہ عنہ نے حجاج سے مذکورہ حدیث کی روایت پر ندامت کا اظہار کیا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پہلے حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بعض احادیثِ فتن کو پوشیدہ رکھا، کیوں کہ آپ نے محسوس کیا کہ لوگوں کو ان حدیثوں کی ضرورت نہیں ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے بھی حکام کے خلاف خروج وبغاوت سے متعلق احادیث کی روایت کو ناپسند سمجھا اور اپنی مسند سے ان حدیثوں کو مٹانے کا حکم دیا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "فتنہ میں

کوئی بھلائی کا پہلو نہیں اور نہ حاکم کے خلاف خروج اور بغاوت میں کوئی خیر ہے“۔

امام ابویوسف رحمہ اللہ نے احادیثِ غرائب کی روایت کو مکروہ کہا ہے۔

امام مالک رضی اللہ عنہ نے بھی بعض ایسی احادیث جن میں بعض صفاتِ باری تعالیٰ کا ذکر ہے ان کی روایت و تحدیث کو ناپسند کیا ہے۔

ان واقعات کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فتنوں کے دور میں ہر معلوم چیز کہنے کی نہیں ہوتی، اور نہ ہر کہنے والی بات ہر حال میں کہی جاتی ہے۔ باتوں کو کنٹرول میں رکھنا ضروری ہے، اس واسطے کہ آپ کو اس کا پتہ نہیں کہ آپ کی بات کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا، اور آپ کی رائے اور آپ کی فہم کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

سلف صالحین رحمہم اللہ نے فتنوں میں سلامتی کو پسند کیا، اس لئے دین میں سلامتی کی خاطر اور اللہ کے پاس صحیح سالم پہنچ جانے کی غرض سے بہت سی چیزوں میں سکوت اختیار کیا۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے جب ان سے فتنہ کے دور میں کچھ کرنے کے لئے کہا تو آپ نے اپنے بیٹے سے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں فتنہ کی قیادت کروں؟ ہر گز نہیں، اللہ کی قسم ہر گز نہیں۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو اس بات سے منع کیا کہ باپ بیٹے دونوں میں سے کوئی اپنے قول یا فعل سے فتنہ کا سردار بنے، چاہے وہ درست اور اچھا کیوں نہ نظر آئے۔ کیوں کہ اس بات کا خوف ہے کہ اس کا انجام ٹھیک نہ ہو۔

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحیح شرعی میزان میں مسائل کو تولیں تاکہ فتنوں سے محفوظ رہیں اور غلطی کا شکار نہ ہوں۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اعمال وافعال اور تصرفات کے کچھ قواعد وضوابط ہیں جن کا لحاظ ضروری ہے، ہر وہ فعل جو کسی حال میں محمود اور قابل تعریف ہو وہ فتنے کے دور میں قابل

تعریف نہیں ہوسکتا۔ خاص طور سے جب اس سے ایسا معنی ومفہوم لیا جاسکتا ہو جو مردانہ ہو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

﴿لولا حدثان قومك بكفر لهدمت الكعبة ، ولبنيتها على قواعد ابراهيم، ولجعلت لها بابين﴾

(اگر تمہاری قوم کے لوگ زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتے تو میں کعبہ کو ڈھا کر دوبارہ اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر تعمیر کر دیتا، اور اس کے دو دروازے کر دیتا)

رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کو ڈھا کر دوبارہ ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر اس کی تعمیر اور اس میں دو دروازے لگانے میں کہ ایک سے لوگ داخل ہوں اور دوسرے سے نکلیں، یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کفار قریش جو نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں کہیں اس کا غلط معنی نہ نکالیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اس سے آپ کا مقصد فخر ومباہات کا اظہار ہے یا قریش کے دین (دینِ ابراہیم کو احمقانہ قرار دینا ہے) یا اس طرح کے دوسرے خدشات، اس لئے آپ اس اقدام سے رک گئے۔

اسی لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بڑا اہم باب باندھا ہے، باب یہ ہے:

﴿باب من ترك بعض الاختيار مخافة أن يقصر الناس عن فهمه فيقعوا فى أشد منه﴾

(راجح اور مختار مذہب کو اس ڈر سے ترک کر دیا جائے کہ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ اس سے بڑے مسئلہ میں مبتلا ہو جائیں)

یعنی کوئی مسئلہ جو آپ کا راجح اور مختار ہو اس کے ذکر کرنے اور نہ کرنے میں آپ کو اختیار حاصل ہو۔ آپ اسے اس ڈر سے ترک کر دیں کہ لوگ اس سے بڑی مخالفت کا شکار ہو جائیں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت یہی حدیث ذکر کی ہے۔

اس سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ عقل و فہم ضروری ہے، عاجلانہ اقدام ناپسندیدہ چیز ہے، آپ کو کس نے مجبور کیا ہے کہ آپ ہر محفل میں زبان کھولیں، اور ہر سوسائٹی میں فتنہ سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔

حق کا بیان علماءِ اہلِ سنت والجماعت کریں گے، آپ کے پاس اگر کوئی رائے ومشورہ اور کوئی تدبیر اور سمجھ ہو تو ان علماء کی خدمت میں پیش کریں، اگر یہ لوگ مان لیں تو اچھی بات ہے، ورنہ آپ اس ذمہ داری سے بَرِی ہوگئے کہ آپ نے اپنی رائے سے سارے مسلمانوں کا آگاہ کردیا۔

۷) ساتواں قاعدہ: (اہلِ ایمان اور اہلِ علم سے موالات ودوستی)

ساتواں اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان بالخصوص علماء سے موالات اور دوستی کا حکم دیا ہے۔

مومن مرد اور مومنہ عورتیں حسب ارشاد باری تعالیٰ:

﴿ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ ﴾ (التوبہ: ۷۱)

(آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ومعاون اور دوست ہیں)

ہر مسلمان کے لئے ضروری اور واجب ہے کہ وہ عام اہلِ ایمان سے محبت کرے، ان کی مدد کرے ان کے استہزاء وتمسخر سے پرہیز کرے، تو یہ برتاؤ ان اہلِ ایمان کے ساتھ کتنا ضروری ہوگا، جو شریعت الٰہی کی نصرت کرنے والے لوگوں کو حلال وحرام کی تعلیم دینے اور انہیں حق کو باطل سے الگ کرکے بتانے والے ہوں۔

علماء کے ذکرِ خیر کے علاوہ کسی اور طرح سے تذکرہ حرام ہے، اور جن مجالس واجتماعات میں علماء کا تذکرہ اچھے الفاظ میں نہیں کیا جاتا وہ بری مجالس ہیں۔

کیوں؟ اس لئے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء نے درہم ودینار اور مال ودولت

وراثت میں نہیں چھوڑی، صرف علم چھوڑا ہے،اس لئے جس شخص نے اس علم کو حاصل کر لیا اس کو اس کا اچھا نصیب مل گیا۔

جس شخص نے علماء کا احترام ملحوظ رکھا، ان کی تعظیم و تکریم کی ، علمائے اہل سنت والجماعت یعنی اہلِ توحید کے اقوال کو اپنالیا،اس نے میراثِ نبوت لے لی،اور میراثِ نبوت چھوڑ کر دوسری طرف نہیں گیا۔

وہ علماء جن کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جن سے محبت و موالات اور دوستی کا رشتہ استوار ہو گا ان کے اوصاف درج ذیل ہیں۔

ا۔ وہ اپنے وقت کے ائمہ اہل سنت و جماعت ہوں،ائمہِ توحید ہوں،توحید و عقیدہ میں ان کو اپنے وقت میں مرجعیت حاصل ہو۔

۲۔ شرعی احکام کی معرفت میں ان کا علم وسیع اور ہمہ گیر ہو،وہ جملہ ابواب فقہ سے آگاہ ہوں،انہیں شریعت کے قواعد وضوابط کا علم ہو،وہ مسائل وقضایا میں کسی التباس اور شک و شبہ کا شکار نہ ہوں۔

یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اہم مسئلہ کا تذکرہ کر دیا جائے، جس کا شکار بہت سے لوگ ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ دورِ حاضر کے ہمارے علماء حالات حاضرہ کا علم وادراک نہیں رکھتے،ایک صاحب نے تو اپنے چند بھائیوں کی چھوٹی سی مجلس میں یہاں تک کہہ دیا کہ ان حالات اور حوادث سے ہم نے یہ سیکھا کہ علماء دو طرح کے ہیں۔ بعض علماء کو حالات حاضرہ کا علم وفہم ہے، جس پر وہ شرعی احکام کی بنیاد رکھتے ہیں،اور علماء کی ایک جماعت ایسی ہے جو حالات حاضرہ کا فہم وادراک نہیں رکھتی !!!

اللہ کی قسم ! یہ بری بات ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ شرعی احکام کی بنیاد واساس کیا ہے۔ علماء کس چیز کو بنیاد بناتے ہیں، مسائل کی سمجھ میں کس چیز

کی رعایت کرتے اور کس چیز کی رعایت نہیں کرتے!

اہلِ علم کے نزدیک حالات حاضرہ کے فہم کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم اس امرِ واقعہ کا فہم جس پر شرعی احکام کی بنیاد ہو، اس کا سمجھنا ضروری ولابدی ہے۔اور اگر کسی نے مسئلہ کی صحیح صورت سمجھے بغیر حکم لگادیا تو اس نے غلطی کی۔

اس لئے کہ حالاتِ حاضرہ کا اگر کسی چیز پر حکم لگانے میں اثر ہے تو اس کا فہم وادراک ضروری ہے۔

دوسری قسم ایسے واقعات کی ہے جن کا شرعی حکم اور فیصلہ پر کوئی اثر نہیں ،تو یہ واقعات چونکہ و چناچہ اور لمبے چوڑے قصّے اور کہانیوں کے قبیل سے ہیں۔ لیکن ان کے فہم و ادراک کا اور ان قصّوں، حکایتوں اور احوال وظروف کا کوئی اثر شرعی فیصلہ پر نہیں ہے۔

ایسی صورت میں علماء سمجھنے کے باوجود اس کی طرف التفات نہیں کرتے،اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر معلوم واقعہ پر شرعی احکام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

میں آپ کے سامنے پہلی اور دوسری دونوں صورتوں کی مثالیں پیش کرتا ہوں، جس سے اس مسئلہ کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے۔

پہلی صورت کی مثال جس میں شرعی حکم امرِ واقع کے فہم وادراک پر مبنی ہے:

میت پر کب یہ حکم لگایا جائے گا کہ وہ مر چکا ہے؟ کیا اس کے دل کے مر جانے سے یا اس کے دماغ کے مر جانے سے؟

یہ ایک نیا مسئلہ ہے، اگر کوئی شخص مسئلہ کی صورتحال سے آگاہی سے پہلے اور حالات کے ادراک سے قبل اس مسئلہ میں رائے زنی کرے گا تو حکم میں یقینی طور پر غلطی کرے گا،اس لئے کہ اس مسئلہ کے مالہ وماعلیہ کو سمجھنے پر شرعی فیصلہ منحصر ہے۔

دوسری مثال: مثلاً حکومتوں پر حکم لگانا، یا حالات پر تبصرہ کرنا کہ فلاں فلاں حکومتیں مسلم حکومت ہیں، یا مسلم حکومت نہیں ہیں، کسی حکومت کے احوال واقعی کو سمجھے بغیر اور اس کی حقیقت کو جانے بغیر اس کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا حکم کیسے لگا سکتے ہیں، یہ ایسا معاملہ ہے جس میں اس حکومت کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے، تاکہ عالمِ دین اس پر شرعی حکم لگا سکے، جب وہ اصل حقیقت کو سمجھ لے گا اسی سمجھ کی بنیاد پر شرعی حکم صادر کرے گا۔

ایک اور مثال: عصرِ حاضر میں بہت ساری اسلامی جماعتیں موجود ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں، کیا ان جماعتوں کے حالات سمجھے بغیر، یا ان کے اعتقادات، اصول و مناہج اور ان کے افکار و خیالات جانے بغیر اور ان کے منہجِ دعوت سے آگاہی کے بغیر کسی عالمِ دین کے لئے ان پر کوئی حکم لگانا یا ان کی کوئی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن ہے؟ نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ان جماعتوں کی حقیقت کو سمجھا جائے، کیوں کہ یہ شرعی حکم میں مؤثر ہے، اور امرِ واقعہ کے سمجھے بغیر جو حکم لگائے گا تو اس کا شرعی حکم ہرگز درست نہیں ہوگا۔

دوسری قسم ایسے حالات اور مسائل کی ہے جن کی کیفیت سے آگاہی کا اثر شرعی حکم پر نہیں ہے۔ اس کی مثال وہ ہے جو دو مخالف شخص کے مابین قاضی اور جج کے پاس اکثر و بیشتر ہوتا ہے۔ قاضی کے پاس دو مخالف شخص آتے ہیں۔ ایک آدمی قاضی سے مسئلہ میں اپنی بات کہتا ہے اور اپنے اور فریقِ مخالف کے درمیان ہونے والی بات کو بتاتا ہے، اور طول کلامی (جس کا علم قاضیوں کو ہوتا ہے) سے کام لیتا ہے، لیکن زیرِ نظر مسئلہ میں قاضی کو اس لمبی چوڑی گفتگو کو جو امرِ واقع ہے معاملہ میں درج نہیں کرتا ہے، اس لئے کہ یہ واقعات فیصلہ میں غیر مؤثر ہوتے ہیں۔ یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جن پر فیصلہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ اسی لئے مفتی یا قاضی ایسے موقع پر یہ کہتا ہے کہ اگرچہ ایسا ہے، یعنی تم نے جن واقعات کا یہاں تذکرہ کیا ہے شرعی حکم میں یہ غیر مؤثر ہیں۔

ایک اور مثال: عہدِ حاضر میں ہم دیکھتے ہیں اور اس مثال سے اس مسئلہ کو میں آپ کے اذہان کے قریب کرنا چاہتا ہوں، کہ نسبتاً عمر میں بڑے بہت سے دعاۃ و مبلغین کمسن بچوں سے میل جول رکھتے ہیں۔ ان میں دعوت وارشاد کا کام کرتے ہیں۔ ان کے دل میں صلاح اور ہدایت کی محبت پیدا کرتے ہیں اور یہ سب عام اجتماعات میں ہوتا ہے۔ یا لائبریریوں میں یا اس طرح کے دیگر مراکز میں۔

ہمیں یہ معلوم ہے کہ بڑوں اور چھوٹوں کے اختلاط اور میل جول میں بعض خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، بلکہ بعض محرمات کا صدور بھی ہو جاتا ہے۔ بعض واقعات کے حوالہ سے ان باتوں کو ہم تفصیلی طور پر جانتے ہیں، ہمارا اس صورتِ حال کا جاننا ہمیں اس فیصلہ کا اہل نہیں بناتا کہ ہم بڑوں کے چھوٹوں میں دعوت کے کام کو ناجائز قرار دے دیں۔

اس بری صورتِ حال سے واقفیت کا دعوت پر حکم لگانے میں کوئی اثر نہیں ہے کہ بڑوں کا چھوڑوں میں دعوت کا کام کرنا غیر شرعی ہے۔

لیکن اس صورت حال کے سمجھنے سے یہاں ایک دوسرے مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ یہ کہ جس شخص سے کوئی غلطی ہوئی یا اس نے کسی حرام کام کا ارتکاب کیا، یا غیر شرعی لباس پہنا یا ایسا لباس جس سے اللہ راضی نہ ہو تو ہمیں اس کو نصیحت کرنی چاہیئے اور توبہ کی دعوت دینی چاہیئے۔

اس صورت حال سے آگاہی کا اثر دعوت کے جواز و عدم جواز کے شرعی حکم میں غیر مؤثر رہا، لیکن جس شخص نے غلطی کا ارتکاب کیا اس کو نصیحت کرنے کی بات اس سے معلوم ہوئی، تاکہ منکر کے ارتکاب کے بغیر، یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک ناپسندیدہ کاموں کے ارتکاب کے بغیر وہ حق کی تبلیغ کرے۔

ان مثالوں میں، میں طول کلام سے کام نہیں لینا چاہتا، ان کا تذکرہ صرف مسئلہ کو سمجھانے کے لئے ہے۔

ایک اور مثال جس پر تنبیہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے ایسے شرعی احکام ہیں کہ لوگوں اور عوام کا ان کے بارے میں اعتقاد اور خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، تو اگر آدمی پیشاب کے چھینٹے اڑنے اور بدن یا کپڑے پر نجاست کے پڑنے سے مامون و بے خوف ہو تو اس کے لئے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز ہے، کیوں کہ رسول اکرم ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ لیکن جاہل اور عوام کے خیال واعتقاد میں جس نے ایسا کیا اس نے غلط کیا، اور اخلاق ومروت کے منافی کام کیا وغیرہ وغیرہ۔

جاہلوں کے اس خیال اور اعتقاد کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حکم صحیح نہیں ہے، یا اس پر عمل نہ ہوگا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا جواز یقینی طور پر صحیح اور ثابت شدہ بات ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شرعی امور میں جاہل کا غلط اعتقاد اور غلط تصور یا کسی بھی حکم میں جاہل کے غلط اعتقاد کا علاج یہ ہے کہ اس کو سمجھایا جائے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ عالم کے صحیح شرعی فیصلہ ہی کو بدل دیا جائے۔

۸)آٹھواں قاعدہ: (کفار ومشرکین سے قطع تعلق اور ترک موالات)

آٹھواں قاعدہ: یہ بہت اہم قاعدہ ہے، اس کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، کفار و مشرکین سے ربط و تعلق اور دوستی کا ضابطہ ہے۔

ہمارے پاس شریعت میں اور ائمہ توحید کے یہاں تولی اور موالات کے دو لفظ ہیں، دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اکثر لوگوں کے یہاں ان میں التباس پایا جاتا ہے، اور ان کے یہاں ان کے معنی گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔

ا۔ پہلا لفظ ''تولی'' ہے۔ یعنی مکمل طور پر دوست بن جانا۔

تولی (یعنی کفار سے مکمل دوستی) سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

۲۔اور موالات ناجائز فعل ہے:

۳۔ تیسری چیز کفار و مشرکین سے استعانت و مدد،اور ان سے اجرت پر کام لینے کا مسئلہ ہے جو چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے۔

یہ تین مسائل الگ الگ ہیں:

ا۔ تولی: یعنی کفار و مشرکین کا مکمل طور پر دوست بن جانا،اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴾

(المائدہ:۵۱)

(اے ایمان والو! تم یہود و نصاری کو دوست نہ بناؤ، یہ تو آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں،اور تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے۔ ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہر گز راہ راست نہیں دکھاتا)

کفار سے مکمل طور پر تولی اور دوستی کا معیار یہ ہے کہ مسلمانوں اور کافروں میں جنگ و قتال کے وقت مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کی جائے،تاکہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہو جائے۔

کفار سے اصل تولی یہ ہے کہ ان سے بھر پور محبت کا تعلق ہو، یا مسلمانوں کے مقابلے میں کفار کی مدد کی جائے۔ پس جس شخص نے کافر سے اس کے دین کفر کی بنا پر محبت کی تو اس نے حقیقت میں اس سے دوستی کی اور یہ کفر ہے۔

۲۔ رہ گیا کفار سے موالات، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار سے دنیاوی امور و معاملات اور مادی ترقی و شان و شوکت کے باعث محبت و مودت کا تعلق قائم کیا جائے، یہ فسق کے قبیل

سے ہے، کفر نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُم مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَن تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِن كُنتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنتُمْ وَمَن يَفْعَلْهُ مِنكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴾ (الممتحنة: ۱)

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور (خود) اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، تم تو دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو، اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس آچکا ہے ، کفر کرتے ہیں۔ رسول کو اور خود تمہیں بھی محض اس وجہ سے جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کے لئے اور میری رضامندی کی طلب میں نکلتے ہو(تو ان سے دوستیاں نہ کرو) تم ان کے پاس محبت کا پیغام چھپ چھپ کر بھیجتے ہو، اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم نے چھپایا اور وہ بھی جو تم نے ظاہر کیا، اور تم میں سے جو بھی اس کام کو کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بہک جائے گا)

اہل علم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ایمان کے وصف سے مخاطب فرمایا ہے ، حالانکہ اس خطاب میں کفار سے مودت و محبت کا رشتہ استوار کرنے والے لوگ بھی داخل ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ ان کا یہ فعل کفر نہیں ہے، بلکہ یہ راہِ حق سے انحراف ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دنیاوی اغراض و مقاصد کے لئے کفار سے مودت و محبت کا معاملہ کیا، تعلق کی اس استواری کا سبب دین اسلام میں شک و تردد نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرح کا تعلق پیدا کرنے والے شخص (یعنی حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ) کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ماحملك علی ما صنعت'' اس اقدام پر تمہیں کس چیز نے آمادہ کیا تھا؟ تو انہوں نے عرض کیا:

”واللہ ما بی إلا أن أکون مؤمناً باللہ و رسولہ، أردت أن تکون لی عند القوم ید یدفع اللہ بہا عن أہلی و مالی۔۔۔۔۔۔“
(اللہ کی قسم! اللہ اور رسول پر میرا ایمان مکمل ہے، اس اقدام کا سبب یہ تھا کہ (چونکہ میں قریشِ مکہ کا حلیف ہوں ان کے قبیلہ کا نہیں ہوں) اس سے میرا ان پر احسان ہو جائے گا، جس سے اللہ تعالیٰ میرے بال بچوں کو ان کے شر سے محفوظ رکھے گا) (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کافر سے دنیاوی اغراض و مقاصد کے لئے مودت و محبت کا تعلق اور اس کی طرف میلان وجھکاؤ اصل ایمان کی بقا اور دین پر اطمینان کی موجودگی میں کفر نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی دوستی اور موالات ہے۔ جس کی اساس دنیاوی اغراض و مقاصد ہیں۔

۳۔ رہ گیا کفار و مشرکین سے مدد طلب کرنا، یا ان کو ملازم رکھنا اور ان سے اجرت پر کام کرانا، تو مختلف احوال و ظروف میں اہل علم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ اہل علم ہر صورت حال اور ہر واقعہ میں اپنی صحیح وصائب رائے کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں۔

کفار و مشرکین کو صدقہ و خیرات دینا، ان کی دل جوئی کرنا، اور ان کے شر و فساد سے بچنے کے لئے ان پر خرچ کرنا، یہ ایک الگ مسئلہ ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ مذکور تینوں قسموں سے الگ مسئلہ ہے۔

۹) نواں قاعدہ: (عبرت و موعظت کے لئے احادیث فتن کا بیان اور حالات حاضرہ پر اس کے انطباق سے پرہیز)

نواں اور آخری قاعدہ اس باب کا یہ ہے کہ مسلمان بھائی کو فتن کی احادیث میں وارد پیش گوئیوں کو اپنے ماحول پر منطبق نہیں کرنا چاہیے۔ لوگوں کا یہ پسندیدہ مشغلہ ہوتا ہے کہ

فتنوں کے ظہور کے وقت اس سے متعلق احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں،اور ان کی مجالس میں اکثر یہ گفتگو ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پیش گوئی فرمائی ہے،اس کا وقت یہی ہے اوراس سے مراد یہی فتنہ،وغیرہ وغیرہ۔

سلف صالحین نے تمام فتنوں سے ڈراتے ہوئے ہمیں یہ بتایا ہے کہ احادیث فتن کو حالات حاضرہ پر چسپاں نہیں کرنا چاہیے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن حوادث کی پیش گوئی فرمائی ہے اس کی حقانیت کا پتہ اس وقت ہی چلتا ہے جب وہ وقوع پذیر ہو جائیں یا گذر جائیں۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول:

''إن الفتنة فی آخر الزمان تکون من تحت رجل من أهل بيتی''

(آخری زمانہ میں میرے خاندان کے ایک آدمی سے فتنہ کا ظہور ہوگا،) کی تفسیر بعض لوگوں نے یہ کی کہ اس سے فلاں ابن فلاں مراد ہے۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان: ''حتی يصطلح الناس علی رجل كورك علی ضلع'' (لوگ ایک آدمی پر اس طرح اکٹھے ہوں گے جیسے چوتڑ پسلی پر)(یعنی لوگ ایک آدمی پر ایک کمزور بنیاد پر صلح کریں گے،جس کا نہ کوئی نظام ہوگا اور نہ اس میں استقامت ہوگی، اس لئے کہ چوتڑ پسلی پر صحیح حالت میں قائم نہیں رہ سکتا،اور نہ اس پر فٹ ہو سکتا ہے۔اس لئے کہ دونوں کے درمیان اختلاف اور دوری ہے)اس سے مقصود فلاں ابنِ فلاں ہے۔

یا یہ فرمان ''يكون بينكم وبين الروم صلح آمن'' (مسلمانوں اور روم میں پرامن صلح ہوگی۔)حدیث کے آخری حصہ تک،کہ اس سے مراد عہدِ حاضر کی صلح ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالاتِ حاضرہ پر ان احادیثِ فتن کی تطبیق اور مسلمانوں میں اس کی اشاعت و ترویج اہل السنة والجماعت کا مذہب نہیں ہے۔

اہلِ سنت والجماعت تو فتنوں کو اور فتنوں کے متعلق احادیث کو ذکر کر کے لوگوں کو ان

سے ڈراتے ہیں، اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنے یا اس کے قریب نہ جانے کی تلقین کرتے ہیں ،تاکہ مسلمان فتنہ میں نہ پڑ جائیں، اور ان (فتن کے متعلق) احادیث رسول ﷺ کی صحت پر اعتقاد رکھیں۔

خاتمہ

تقریر کے اختتام پر میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیں راہ حق دکھائے، حق کی اتباع کی توفیق دے، حق پر چلنے کی ہمیں طاقت و قوت دے، اتحاد اور ثابت قدمی دے کر ہم پر اپنا احسان فرمائے، اہلِ سنت والجماعت کے منہج اور ان کے سارے عقائد کا متبع بنائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ان کے اقوال و معتقدات اور شرعی دلائل کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں۔

اے اللہ! ہم دعا گو ہیں کہ تو ہمیں ظاہری اور باطنی سارے فتنوں سے بچا لے، مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں کو نیک اور صالح بنائے، ان کو رشد و ہدایت کی توفیق دے، ان کے اور کج رووں، گمراہوں اور مفسدوں کے مابین دوری کر دے۔ آمین یارب العالمین

اے اللہ! ہم تیرے سوالی ہیں ۔تو ہم پر اپنا رحم فرما، ہمارا خاتمہ بالخیر فرما، موجودہ فتنوں کے نتائج و عواقب کو مسلمانوں کے حق میں خوشگوار اور پسندیدہ بنادے، فتنوں کے شر و فساد اور برائی سے ہمیں دور رکھ ،اس کے شر اور فساد کو دشمنانِ اسلام کے حق میں کر دے، آمین یارب العالمین۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن اھتدی بھداہ إلی یوم الدین

نوٹ :وزیر موصوف کی یہ تقریر کیسٹ سے اکرم بن سردار شیخ نے بتاریخ ۲۲/۵/۱۴۱۱ ہجری نقل کی ،اور اس کے نقل کو کیسٹ سے ملایا گیا۔